اعلیٰ تعلیم سے "تعلیم" کی بے دخلی

ڈاکٹر محمد صبیح انور

ہمارے استاد طاہر شادؔانی صاحب سکول کے زمانے میں یہ شعر سنایا کرتے تھے ؎

علم را بر دل زنی، یارے بود

علم را بر تن زنی، مارے بود

یعنی "اگر تُم علم دل کی تربیت اور نفس کے تزکیے کے لیے حاصل کروگے، تو وہ دوست بن کر تمھارا ساتھ دے گا لیکن اگر تحصیلِ علم کا مقصد مال و دولت اور تن پروری بن جائے تو وہی علم سانپ بن کر تمھیں ڈَس لے گا۔" مولانا رومیؔ، جن کا یہ شعر ہے علامہ اقبال کو بھی اپنا فکری فیض منتقل کرتے تھے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ قونیہ جہاں مولانا رومیؔ زیرِ آرام ہیں، وہاں اقبالؔ کی غائبانہ قبر بھی موجود ہے۔ علاّمہ نے اپنے روحانی مرشد کے اِسی خیال کو اُردو زبان میں یوں بیان کہا تھا ؎

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت

فیصلہ تیرا ترے ہاتھ میں ہے، دِل یا شکم!

آج کے مشینوں بلکہ مصنوعی مشینوں کے دور میں تعلیم و تدریس کا حُلیہ بالکل بدل گیا ہے۔ تختۂ سیاہ تختۂ سیمیں بن گیا ہے جہاں ایک بدخط استاد بھی ہاتھ کے اشارے پر رنگ و صَوت کی دُنیا بکھیر دیتا ہے اور شاگرد رنگ بدلتی تصویروں کو دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔ استاد اور شاگرد کا تعلق بھی پیر و مرشد، رُوحانی والدین اور اولاد کا نہیں بلکہ خادم اور مخدوم، آجِر اور اجیر کا بن گیا ہے۔ حصولِ تعلیم کے بَرخط (Online) ذرائع نے حصولِ علم کا پُورا عمل پُر تفریح اور آرام دِہ بنادیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ تعلیمی ادارے اپنے تشہیری پیغامات میں پُر آسائش کمرہ ہائے جماعت اور تعلیم مکمل کرلینے کے بعد روزگار کے بہترین مواقع کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بعض تو

فارغ التحصیل طلبہ کی اوسط تنخواہوں کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ سالانہ نظامِ امتحانات سے چہار ماہی نظام کی تبدیلی نے بھی تدریس کے عمل کو تیز اور بے رحم بنادیا ہے جہاں چلنے والے نکل گئے اور جو ذرا ٹھہرے، کُچلے گئے۔ مزید بر آں اس نئے نظام نے کئی نفسیاتی اُلجھنوں کو بھی جنم دیا ہے۔

ہمارے ملک کے تعلیمی نظام میں یہ سب تبدیلیاں، ظاہر ہے، کسی خود افروزی اور خود احتسابی کا نتیجہ نہیں بلکہ اپنے قدیمی اور روایتی نظامِ تعلیم سے تعلق توڑ لینے کے بعد ہم بین الاقوامی رویّوں کو اپنانے اور ان میں تکمیل حاصل کرنے کو ہی اپنی معراج تصور کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی کمیشن (HEC) کے تمام معیارات بھی اس نئے اندازِ تعلیم کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر پنجاب کے تمام کالجوں میں چار سالہ چہار ماہی نظامِ امتحانات کی حوصلہ افزائی، اساتذہ کی ترقی کے قواعد وضوابط، طلبہ کو دورانِ طالبِ علمی پیشہ ورانہ اداروں سے مختصر وابستگی یعنی انٹرنشپ کی ترغیب، جامعات میں مصنوعات کی تیاری اور ان کے منافع بخش کاروبار کی ترویج کے لیے محکموں کے قیام کا حکم، اِس نئے نظامِ تعلیم کے چیدہ چیدہ پہلو ہیں۔ نیز تحقیقی مقالوں کی حرِص اور عالمی درجہ بندی کی دوڑ نے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی توجہ کا رُخ مکمّل طور پر موڑ دیا ہے۔ بعض اداروں میں قواعد و ضوابِط کی حد سے بڑھی پاسداری اور رکھوالی نے استاد کو کلرک بنادیا ہے ؎

ذہن پر فائلوں کے بارِ گراں

چُور جن سے ہیں ذہانتوں کے وجود

تعلیم کی یہ بدلی حالت یقیناً ایک عالمی تبدیلی کا شاخسانہ ہے۔ دورِ حاضر روشن خیالی کا دور (era of enlightenment) تصوّر کیا جاتا ہے جس میں انسانی فِکر نے منطق، ریاضی، تحلیل اور دلیل کی صلاحیّتوں کو استعمال کر کے اور الہامی افکار کی روایت پسندی کو چھوڑ کر ایک نئی دُنیا تخلیق کی۔ موجودہ نظامِ تعلیم اسی نئے نظامِ حیات کو گود میں پلا بڑھا۔ ظاہر ہے روایت سے جڑے رہنا اور جدیدیت سے اللہ واسطے کا بیر رکھنا کوئی دانشمندی نہیں۔ اگر ہم نے اِن تبدیلیوں کو سِرے سے تسلیم ہی نہ کیا اور ماضی کی رُومان پرستی میں پھنسے رہے اور خِرد، صنعت و حرِفت، سائنسی طرزِ استدلال سے باغی بن گئے تو صورتِ حال یہ ہو جائے گی کہ ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا

ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

میرا مقصد ان تبدیلیوں کو برا بھلا کہنا نہیں۔ لازمی بات ہے ہمیں ان جدید ضرورتوں سے ہم آھنگ ہونا پڑے گا۔ تعلیم کے شعبے میں ہونے والی بین الاقوامی تحریکوں میں شامل ہونا پڑے گا۔ میں صِرف یہ یاد کرانا چاہتا ہوں کہ تعلیم کی غایتِ اولیٰ طلبہ کی ذہن سازی ہے تاکہ وہ انسانی معاشرے کے روشن ضمیر اور سلجھے ہوئے فرد بن سکیں، اپنی فِکری صلاحیتوں کو پہچان کر معاشرہ سازی میں اپنا حصہ ڈال سکیں۔

سر سید احمد خان جیسے روشن خیال ماہرِ تعلیم نے بالکل اسی طرح ایک مغلوب قوم کی نبض کو تھاما اور انہیں انگریز حکمرانوں کے نظامِ تعلیم سے متعارف بھی کرایا اور اُنھیں اس نظامِ تعلیم کے دھارے میں بہہ جانے کا مشورہ بھی دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی عملی واقعیّت پسندی کے ذریعے سے ہندوستانیوں کو یورپ کی نئی دریافت شُدہ تعلیم سے رُوشناس بھی کرایا۔ لیکن سر سید کو شاید اس تہذیب کا سامنا نہیں تھا جس سے ہم آج دوچار ہیں۔ عالمیت کے طوفان میں ذرائع ابلاغ کا ہر جائی وجود، آلات کا نسبتاً آسان اور سستا حصول اور دوسری طرف اقتصادی نا ہمواری اور بے روزگاری سے سے مقابلہ کرتی گرتی پڑتی زندگی نے آج کی تعلیم کو سر سید کے "تہذیب الاخلاق" کے فلسفے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ گویا نظامِ تعلیم کا شخصیت سازی، ذہن سازی، فکر سازی اور اخلاق سازی سے علانیہ نہیں تو غیر ارادی اعلان بر أت ضرور ہے۔ ملک میں پھیلے لاکھوں مدرسے اور چند درد مند ماہرینِ تعلیم کی انفرادی کوششوں کو چھوڑ کر ہمارے عمومی تعلیمی ادارے اخلاقی تربیت کے سِرے سے مکلّف ہی نہیں رہے۔

شاگردوں کی اخلاقی تربیت اور ذہنی آبیاری کے لیے بارش کا پہلا قطرہ کمرۂ جماعت یا (پی ایچ ڈی شاگرد کے لیے) اُستاد کا حلقۂ تلمُذ ہوتا ہے۔ مگر نئے نظامِ تعلیم نے شاگرد پر توجہ کے لیے استاد کے پاس وقت ہی کہاں چھوڑا ہے۔ شاگرد وقت کی منجدھار پر اکیلا ہے۔ آج ہمارے تعلیمی اداروں کا اوسط درجے کا طالبِ علم انٹرنیٹ اور درسی چربوں کے تھیپڑوں پر ہچکولے کھاتا نظر آتا ہے۔ اس کے پاس وہ وقت، فرصت اور ذہنی فراغت ہی موجود نہیں جو اسے بلند خیالات اور اونچے مقاصِد کی طرف اُڑا سکے۔

تخلیقی عمل کے لیے انتہائی درجے کا سکون اور خاموشی درکار ہوتی ہے۔ سوشل میڈیا اس سکوت کو بار بار توڑتا اور خلوت کو جلوت بناتا ہے۔ یہ ماورائی سائبر انجمن آہستہ آہستہ ہمارے حواس پر حاوی ہو جاتی ہے۔ ہر وقت کی مکالمہ بازی چار وناچار ہمیں ہر موضوع پر رائے قائم کرنے کا التزام کرتی ہے۔ یہ رائیں ہمارے تعصبات کو بڑھاتی ہیں۔ جستجو، کم آمیزی اور کم مائگی، جو طالبِ علم کی بنیادی شرائط ہیں، احساسِ منزل یابی اور تفاخُر سے بدل جاتی ہیں۔ معلومات کی ارزانی علم کی بے وقعتی کا سبب بن جاتی ہیں۔ کتاب بینی ایک بوجھ محسوس ہوتی ہے۔ علم کی خاطر مشقت اٹھانا مشکل لگتا ہے۔ طبعیت تفنّن اور تفریح کی تلاش میں رہتی ہے۔ گویا معلومات انٹرنیٹ کی صراحی سے قطرہ بہ قطرہ ٹپکتی ہیں جس میں روح سیر اب نہیں ہو پاتی، ہاں وقتی پیاس ضرور بجھ جاتی ہے۔

جدید تعلیمی نظام میں استاد اور شاگرد کے درمیان تعلق واجبی سا رہ گیا ہے۔ استاد مصروف ضرور ہے، مگر درس و تدریس میں نہیں بلکہ انتظامی امور میں۔ اکثر و بیشتر اعلیٰ تعلیمی ادارے سیاست کی زد میں ہیں۔ مقدمہ بازی معمول بن گیا ہے۔ اساتذہ انتظامیہ اور انتظامیہ اساتذہ کو کچہریوں میں دھکیلتی نظر آتی ہے۔ پیچ در پیچ انتظامی اور قانونی الجھنوں نے اِن اداروں کے سربراہوں کو بے بس بنا دیا ہے۔ کمرۂ جماعت میں طلبہ کی سطح پر نیا نصاب ترتیب دینا یا موجودہ موضوعات میں ترمیم کرنا جان جوکھوں کا کام بن کے رہ جاتا ہے۔ نئے مضامین کو متعارف کرانے کے لیے کئی مراحِل سے گزرنا پڑتا ہے۔ سائنس کے میدان میں عملی تجربہ گاہیں قلتِ وقت اور سہل پسندی کی وجہ سے کالعدم ہو گئی ہیں۔ اِطلاقی شعبوں کی چکا چوند نے بنیادی نظری علوم (theoretical sciences) کو چُندھیا دیا ہے۔ وُہ سائنس جو کسی اَن دیکھے خیال کی تلاش میں رہتی ہو، اب غیر ضروری سمجھی جانی لگی ہے۔ تحقیق کا تعلق سرمایے سے جُڑ گیا ہے۔ تحقیقات کی کامیابی کے تمام پیمانے کیفیت نہیں بلکہ کمیت سے منسلک ہو گئے ہیں۔ الغَرض علم، حکمت سے عاری ہوتا نظر آرہا ہے۔ اِس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مشین نے اس بے رحمی سے فرد کی جگہ لے لی ہے کہ استاد اور شاگرد کا انفرادی، انسانی اور شخصی تعلق دھندلا پڑ گیا ہے۔

تعلیم اور درس و تدریس انسانی فطرت کا بہترین سودا ہیں۔ اگر اس عمل میں سے لطیف انسانی جذبات، ہمدردی اور غم خواری، مرتبوں میں پیچھے رہ جانے والے شاگردوں کے لیے خصوصی التفات، استاد کا ادب و

احترام، بہترین اخلاق، امانت و دیانت، تحمل اور اختلافِ رائے کا احترام، الغرض "احترامِ آدمیت" نکال دیں، تو تعلیم کا مقصد بدل جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ روشن خیالی کے دور میں، جو پُرکاری اور ہُشیاری، فتح مندی کی حرص اور آگے بڑھنے کی لگن سے عبارت ہے، کہیں ہم اپنی انسانی مَقدِرَت سے ہی تجاوز نہ کر جائیں۔ اپنی بساط سے بڑھ کر بوجھ لے لیا تو معاشرے کے ناتواں اور تعلیمی لحاظ سے "ناکام" کہلائے جانے والے طلبہ ایام کی گراں باری کا بوجھ بھی نہ سہہ سکیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بالکل پیچھے رہ جائیں۔ علم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو ہمارے معاشرے میں برابری اور اتحاد کی ضمانت دے سکتا ہے، ہماری مالی استعداد اور حسب نسب، ذات پات، مذہب اور فِرقے پر پردہ ڈال سکتا ہے۔

استاد اور شاگرد کا تعلق عقلی تعاون سے عبارت ہے مگر اس کا ایک لازمی جُزو جذباتی تعاون بھی ہے۔ بلکہ جذباتی لگاؤ کے بغیر علم الفاظ، نظریات، کلیات اور سائنسی پیشگوئیوں کی کوئی بلند و بالا عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی تا کُجا علم کا ذوق ہی پیدا کیا جاسکے۔ سابق وائس چانسلر جامعہ پنجاب پروفیسر حمید احمد خاں نے ۲۰ مارچ ۱۹۶۶ء کو گورنمنٹ کالج، جوہر آباد کے جلسۂ عطائے اسناد وانعامات میں فرمایا تھا: "اچھا اُستاد شاگرد کے ظاہر سے واقف ہونے پر اکتفا نہیں کرتا وہ اس کے باطن کو سمجھتا ہے اور اس کی پوری شخصیت کا احاطہ کرتا ہے اور اس طرح خود اپنے نفس کو بھُول کر ایک اور نفسِ انسانی کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔ خود فروشی اور خود فراموشی کے اس عمل میں استاد اپنے صحیح مقام و منصب کو پہنچتا ہے"۔ ("تعلیم و تہذیب" پروفیسر حمید احمد خاں، مجلسِ ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۲۴۱)

میں یہی کہنا چاہوں گا کہ "اعلیٰ تعلیم" میں ایک بار پھِر "تعلیم" کو داخِل کرنا ہو گا اور تعلیم میں جو فی نفسہٖ خوبیاں موجود ہونی چاہییں، ہمیں انھیں بھی اہمیت دینا ہو گی۔ مثال کے طور پر نوجوانوں کی ذہنی اور فکری استعداد بڑھانے کے لیے سکون، تحمل، سرمایے سے بے نیازی، آسائش سے بے رغبتی، وقت کی فراوانی، حفظِ مرتب، آزادیِ رائے اور خاموش اضطراب درکار ہے۔ یہ وُہ روشن ضمیری ہے جسے روشن خیالی نے چھُپا دیا ہے جِس کے نتیجے میں یقین کی صاف روشنی کی نسبت بے یقینی اور شک کی گنجلک بہتر سمجھی جانے لگی ہے۔ شاگرد

کے لیے تسلیم و رضا ایک خوبی نہیں نالائقی کی علامت بن گئی ہے۔ خود افراوزی کی جگہ خود نماتی بہتر بن گئی ہے۔ والدین، طلبہ اور اساتذہ کا حتمی مطمعِ نظر یہی ہے کہ وُہ تعلیم کے ذریعے معاشرے میں اپنا معاشی رُتبہ اور سماجی رُعب قائم کر سکیں۔ حصولِ علم کے یہ سب مقاصد جائز ہوں گے مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے، مرکزی نہیں۔ تعلیم سوداگری نہیں، نہ ہی جماعت دکان۔ استاد خلائی مخلُوق نہیں، نہ ہی شاگرد روبوٹ۔ ذہن کمپیوٹر نہیں اور نہ ہی یونیورسٹی کارخانہ۔ تعلیم ایک انسانی وجود سے دوسرے تک عِلم و حِکمت کے بہاؤ کا نام ہے اور یہ بہاؤ دو طرفہ ہے۔ استاد شاگرد سے سیکھتا ہے اور شاگرد استاد سے۔ اس انسانی تعلق کو بحال کرنے کے لیے کمرۂ جماعت کی اکائی کو آزاد کرنا ہو گا۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے کے استاد کو بھی آزاد کرنا ہو گا تا کہ وہ سکون سے، عِزت سے روحِ انسانی کی صنعت گری کر سکے۔ تعلیم اور تربیت کا توازن قائم کرنا ہو گا۔ جستجو اور ان دیکھے رستوں کے تلاش ہی علم کا حُسن ہے۔ نئے علم اور نئے موضوعات کی تخلیق ایک اچھی تعلیم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہمیں سوچنا ہو گا کی کیسا نظامِ تعلیم ہمیں ان مقاصِد کو حاصِل کرنے کے لیے تیار کرے گا۔

ڈاکٹر محمد صبیح انور ڈاکٹر محمد صبیح انور خوارزمی سائنس سوسائٹی کے رکن ہیں۔ طبیعیات کے محقق اور استاد ہیں اور لمز کے شعبہ فزکس سے وابستہ ہیں۔ ان کے فزکس کے مختلف موضوعات پر لیکچر جو کمرہ جماعت میں فلمائے گئے ہیں، اس لنک پر دیکھے جا سکتی ہیں:
https://www.physlab.org/courses-taught/
ڈاکٹر صبیح نے ملک میں یونیورسٹی کی سطح پر عملی طبیعیات اور سائنس کی ترویج پر قابلِ ذکر کام کیا ہے۔